کمی نرمی اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی، شاخوں نے جھوم جھوم کر وجد کیا، تو اپنی سنگینی اور بے حسی بھی ضرور یاد آ گئی۔"

اس اقتباس میں رعایت لفظی، حسن تراکیب، اور نت نئے انداز میں تشبیہی پیکروں کے ابھارنے کا انداز، مولانا کے ابتدائی پرشکوہ طرز نگارش اور علمی دبازت سے یکسر مختلف ہے۔ اس اسلوب تحریر کو علمی سے زیادہ تخلیقی اسلوب کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ تذکرے کے بعد مولانا کے جو نثری اسالیب ملتے ہیں وہ پورے طور پر مندرجہ بالا نثر ہی کے اسلوب کی توسیع ہیں۔ یہ اقتباس دراصل اس تبدیلی کا اشارہ ہے جو مولانا کی علمیت، بلند آہنگی اور خطابت کے ساتھ ان کی نثر میں تخلیقی اور شعری عناصر کی شمولیت کا پتا دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ صرف غبار خاطر میں ہی نہیں بلکہ ترجمان القرآن میں بھی موصوف کو جہاں کہیں مسائل و مباحث پر تفصیل سے اظہار خیال کا موقع ملا ہے، انھوں نے اپنی علمیت کے ساتھ سلاست بیان اور تخلیقی شان کے جوہر ضرور دکھلائے ہیں۔ یہ وہی سلاست بیان اور تخلیقی اسلوب نثر ہے جس کو بالعموم مولانا کی نثر نگاری کے پورے سیاق و سباق میں دیکھنے کے بجائے صرف غبار خاطر کے تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اس طرز تنقید کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا کی نثری خدمات کا دائرہ کار کم از کم ہم اردو ادب کا زاویۂ نگاہ رکھنے والوں کے لیے، عموماً مولانا کے انشائیہ نما مکاتیب اور مکتوب نما انشائیوں کے دائرے میں حصار بند ہو کر رہ گیا۔ البتہ جن معدودے چند نقادوں نے مولانا کی ابتدائی نثر کو موضوع بحث بنانے کی کوشش کی، انھوں نے پس منظر پر آتنی توجہ صرف کی کہ خود اصل منظر دھندلا ہو کر رہ گیا۔ مولوی عبدالحق اور محمد حسن عسکری نے آزاد کی نثر کو اردو نثر کے بنیادی سلسلۂ نسب سے دور قرار دیا اور اس پر غیر ضروری صناعی بلکہ مصنوعی زبان ہونے کا الزام عائد کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان کے برخلاف ایک اور ہی زاویۂ نگاہ اختیار کیا۔ ان کو مولانا آزاد کا بنیادی اور سچا اسلوب الہلال اور البلاغ میں نظر آیا اور غبار خاطر ان کی نگاہ میں پژمردہ اور تھکے ہوئے اسلوب کی نمائندہ کتاب ٹھہری۔

> "ان کے بلند پایہ ادبی کارناموں میں غبار خاطر ہی ایک ایسی کتاب ہے جو ابوالکلام کی اصلی نثر سے بہت دور ہے۔ اس میں ابوالکلام کی تصویر بہت مدھم اور دھیمی ہے۔ اس میں ابوالکلام کا قلم بیمار اور ضعیف معلوم ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ غبار خاطر میں ابوالکلام کی وہ علمی شان بہت کم نمودار ہوئی ہے جس کے طفیل وہ عزت و عظمت کے مستحق بنے تھے اور سچ یہ ہے کہ غبار خاطر اس داعیۂ عظیم اور جذبۂ شدید سے بھی خالی ہے جس کے شعلے الہلال میں مشتعل ہو کر اقصائے ہند میں آگ لگا چکے تھے۔ اردو ادب میں ابوالکلام کا امتیاز خاص ان کی بارعب اور پر جلال نثر ہے جس کی روح، قوت اور توانائی، سخت کوشی اور دشوار پسندی میں مضمر ہے۔"
>
> (بحوالہ زاویۂ نگاہ ۲۰۲ خلیل الرحمن اعظمی)

یہ نقائص اگر غبار خاطر کی نثر کے ہیں تو ترجمان القرآن کی نثر کے بھی ہیں، اور ان تمام مکاتیب و مضامین کی نثر کے بھی جو نثر مولانا آزاد کی ذہنی و فکری پختگی اور ایک کہنہ مشق نثر نگار کے اعتدال و توازن کے عہد کی سچی اور حقیقی نمائندگی کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ صورت حال ایسی نہیں۔ اس لیے کہ غبار خاطر کا اسلوب نگارش کسی اچانک تبدیلی کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ اسلوب اس تدریجی ارتقا کی آخری کڑی ہے جس کا سلسلہ تذکرہ کے بعض مقامات سے شروع ہو گیا تھا (جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا) اور جس اسلوب کو ترجمان القرآن لکھنے کے زمانے میں پختگی اور استحکام حاصل ہوا یہی سبب ہے کہ ترجمان

القرآن اور غبارِ خاطر کے نثری اسلوب میں بعض حیرت انگیز مماثلتیں ملتی ہیں۔ بسا اوقات یہ مماثلتیں موضوعات اور مضامین کی بھی ہیں۔ مگر دونوں کتابوں میں مولانا کا اسلوبِ نگارش اپنے موضوع سے ہی فیضان حاصل کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موضوعاتی مناسبت و مماثلت کے ساتھ اُن کے مخصوص اسلوب کی تشکیل کے عناصر بھی جس طرح دونوں جگہ یکساں ہیں اسی طرح تذکرہ سے پہلے کے اسلوب سے بڑی حد تک مختلف اور ممتاز بھی ہیں۔ سہولت کی خاطر ایک ہی موضوع پر اظہار کے دو نمونے، ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر، سے پیش کیے جا سکتے ہیں جس موضوع پر تذکرہ کے ایک اقتباس کو پیش کر کے آغازِ گفتگو میں مولانا کے بدلے ہوئے اندازِ نثر کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا غبارِ خاطر میں ایک جگہ اپنے گزرے ہوئے دنوں کا حساب ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"....جس نامراد ہستی کو چودہ برس کی عمر میں زمانہ کی آغوش سے اس طرح چھین لیا گیا ہو، وہ اگر کچھ عرصہ کے لیے شاہراہِ عام سے گم ہو کر آوارۂ دشتِ وحشت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا....... اگرچہ قدم قدم پر ٹھوکروں سے دوچار ہونا پڑا اور چپہ چپہ پر رکاوٹوں سے الجھنا پڑا مگر طلب ہمیشہ آگے ہی کی طرف بڑھائے لے گئی اور جستجو نے کبھی گوارہ نہیں کیا کہ درمیانی منزلوں میں رُک کر دم لے لے۔ بالآخر دم لیا تو اس وقت جب منزلِ مقصود سامنے جلوہ گر تھی اور اس کی گردِ راہ سے چشمِ تمنائی روشن ہو رہی تھی ـــــ تو جس برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرتِ شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں، میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلوؤں کے کانٹے چن رہا تھا۔"

(غبارِ خاطر، ۱۰۳)

ترجمان القرآن کے مقدمے میں مولانا اصولِ تفسیر سے بحث کرنے کے بعد ایک مفسّر کی حیثیت سے جہاں ذہن اور زندگی کی ناقابلِ عبور وادیوں کو سر کرنے کا تعلّی آمیز ذکر کرتے ہیں اور یوں اپنی اہلیت کا اعتراف کرانا چاہتے ہیں وہاں بھی ان کے اسلوبِ بیان میں علمیت کے ساتھ ساتھ وہی تخلیقی شان پیدا ہو جاتی ہے جو غبارِ خاطر میں جگہ جگہ دیکھنے میں ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"..... میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ایسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں ـــ میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفا کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا، تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہِ عام پر نہ تھا۔" ترجمان القرآن (مقدمہ ۱۹)

• یہ بظاہر ایک درماندہ مسافر کی گردِ سفر ہے، مگر درحقیقت تمام متخالف رجحانات اور عوامل سے ثابت و سالم نکل آنے کا فن کارانہ اعلان بھی ہے۔ یہ اعلان غبارِ خاطر کے مذکورہ بالا اقتباس میں بھی ہے۔ مگر اس میں وضاحت ہے، بلند آہنگی ہے اور کہیں کہیں خودستائی کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے، ترجمان القرآن کے ان جملوں میں جو کچھ ہے وہ تحت البیان میں ہے۔ مگر جو بات دونوں اقتباسات میں مشترک ہے وہ ان کی تخلیقی شان ہے۔ اس تخلیقیت کو پیدا کرنے کے لیے شعری وسائل کا بھی سہارا لیا گیا ہے اور شعریت سے الگ ہو کر بیانیہ اور بیانیہ میں خودکلامی کی کیفیت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش شعوری ہے یا غیر شعوری اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا

ہے کہ اس لب و لہجے میں بات کہنے کی کوشش سے ہر چند کہ مولانا کی صحافتی نثر بھی محروم نہیں اور ابتدائی زمانے کی بعض دوسری تحریریں بھی۔ مگر اس نوع کی ابتدائی تحریروں پر ان کا بوجھل اسلوب غالب ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ اور تراکیب جگہ جگہ غرابت لفظی پیدا کرتے ہیں اور کم و بیش وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے بعض اہلِ نظر مصنوعی طرز نگارش سے موسوم کر چکے ہیں۔ دور اول کی اس قسم کی تحریروں کے برخلاف ترجمان القرآن میں اُن کا اسلوب 'فطری اظہار' اور غیر مصنوعی سلیقۂ گفتار کا احساس دلاتا ہے۔ ترجمان القرآن میں مولانا کی نثر عربیت زدگی سے نجات یافتہ بھی ہے اور ساتھ ہی قرآنی آہنگ سے لبریز بھی ہے، مولانا کی نثر میں عربیت زدگی اور عربی لہجہ بالخصوص قرآنی آہنگ کے فرق کو محسوس کرنے کے لیے مولانا کے اداریوں سے لے کر تذکرہ کے بیشتر حصوں کو اول الذکر کی مثال کے طور پر، اور ترجمان القرآن اور غبار خاطر کی نثر کو مؤخر الذکر آہنگ سے مملو ہونے کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں زجر و توبیخ، عبرت و نصیحت اور استفہام و استعجاب کے جن لہجوں سے ہم دوچار ہوتے ہیں ان کی جھلک ان اقتباسات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مولانا غبار خاطر میں ایک جگہ حکایت بادۂ تریاک، کے ذیل میں قدرتِ خداوندی کے بوقلموں جلوؤں کا نظارہ اس طرح کرتے ہیں:

"اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں تو صرف قیدخانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیغام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب مسکراتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا۔ قیدخانے کے روزنوں میں لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شادکام رکھے، کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب الٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی [redacted] نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گردوپیش میں کھوئے رہتے ہیں۔" (غبار خاطر ۶۹)

نثر کا یہ لہجہ جہاں مولانا کے خطیبانہ طرز اظہار کا نمونہ ہے وہیں لفظوں کی نشست و برخاست اور جملوں کا دروبست اس قرآنی اسلوب سے بھی ہم آہنگ ہے جس کا سراغ ان کو تفسیر قرآن لکھنے کے دوران میں ملا تھا اور اسی اثنا میں مولانا نے اپنے دوسرے دور نگارش کو اپنے مخصوص، پختہ اور منفرد اسلوب کی شکل میں استحکام بخشا تھا۔ اس بات کی توثیق ترجمان القرآن کے مختلف مباحث کی نثر سے کی جا سکتی ہے۔ سردست ایک ایسے نمونے پر اکتفا کیا جاتا ہے جس کا انداز تحریر محولہ بالا اقتباس سے بڑی حد تک مماثل ہے۔

"چیونٹی اپنے بل میں رینگتی رہتی ہے، کیڑے مکوڑے کوڑے کرکٹ میں ملے ہوتے ہیں، مچھلیاں دریا میں تیرتی ہیں، پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں، پھول باغ میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں، لیکن فطرت کے پاس سب کے لیے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضان ربوبیت سے محروم ہو۔

یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر سے ڈول بھر بھر کر فضا میں پانی کی چادریں بچھا دیں، پھر ہواؤں کے جھونکے انھیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسا دیں ...... کیوں ایسا ہوا کہ

پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں۔ پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں، پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے اُبلنے لگتے ہیں، پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں، پھر جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئی دور دور تک دوڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک اپنی وادیاں شاداب کر دیتی ہیں۔"

(ترجمان القرآن صفحہ ۳۶، ۳۸)

یہ نثر غبارِ خاطر کے انشائیے کی نثر نہیں بلکہ ترجمان القرآن کے اس حصے کی نثر ہے جس میں مولانا نے ربوبیتِ باری کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے علمی، استدلالی اور تخلیقی اسلوب کو قرآنی آہنگ کے زیر و بم سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اس اسلوب میں کبھی خطاب کی لذت ملتی ہے، تو کبھی رجزیہ انداز کی حرکت، اس میں دیکھی ہوئی دنیا کو نئے زاویوں سے دکھانے کی کوشش بھی ہے اور حافظے اور حواس کو استعمال کرنے کی ترغیب بھی۔ یہ اگر صرف خطابیہ انداز پر مبنی نثر ہوتی تو اس میں صرف تکرار اور بلند آہنگی سے کام لیا گیا ہوتا۔ جب کہ اس میں حقائق، ایک دوسرے کے بعد مسلسل بیان ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر تمام حقائق کو کسی کلیے کے تابع کر دیا جاتا ہے۔ ترجمان القرآن میں نثر کے ایسے نمونے ان گنت ہیں اور غبارِ خاطر کی نثر واضح طور پر اسی نثری اسلوب کی توسیع ہے۔ غبارِ خاطر میں مولانا اگر اپنے مکتوب الیہ سے ہم کلام ہوتے ہیں تو مکالماتی فضا پیدا کر دیتے اور جب آزادانہ طور پر اس صنف مکتوب یا صنف انشائیہ کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں، تو ان کا انداز خود کلامی کا ہو جاتا ہے۔ اس طرح غبارِ خاطر کا معتد بہ حصہ مکالمے اور اور خود کلامی کے لب و لہجے کا بھی احساس دلاتا ہے، مگر یہ لب و لہجہ مولانا کے بنیادی علمی، استدلالی اور خطیبانہ لہجے پر مستزاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم یہی مستزاد عنصر ان کی نثر کو تخلیقی نثر کی بعض نئی جہات سے بھی آشنا کرتا ہے۔ ان جہات کا سراغ سب سے پہلے ترجمان القرآن کی نثر میں کیوں کر لگایا جاسکتا ہے اس کی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔ اب ذرا یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ کہیں ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر کے متذکرہ بالا اقتباسات میں اسلوبیاتی مماثلت محض اتفاقی تو نہیں ہے؟ اس سلسلے میں موضوعاتی یکسانیت ہماری زیادہ مدد کر سکتی ہے۔ ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر کو اگر زمانی بُعد کے ساتھ نہ پڑھا جائے اور ایک ساتھ دونوں کو سامنے رکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ تقریباً پندرہ بیس سال کے فرق سے لکھی جانے والی تحریروں میں موضوع اور اظہار کی ہم آہنگی کس حد تک دونوں کتابوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیتی ہے۔ یہ بات تو کسی کی نگاہ سے مخفی نہیں کہ مولانا آزاد نے خواہ صحافیانہ مضامین لکھے ہوں، تقریریں کی ہوں، مختلف موضوعات پر کتابچے لکھے ہوں، انشائیہ نگاری کی ہو، خطوط لکھے ہوں یا تفسیرِ قرآن لکھی ہو، وہ ہر جگہ اپنے عالمانہ اور مذہبی منصب پر فائز نظر آتے ہیں، اس لیے اگر ترجمان القرآن کے مباحث و موضوعات، حتیٰ کہ اسلوبِ تحریر کی گونج ان کی بعد کی تحریروں میں نمایاں معلوم ہوتی ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اب رہی موضوعاتی مناسبت اور تعلق کی بات، تو ترجمان القرآن میں ربوبیت کی کوئی بحث پڑھ جائیے اور پھر غبارِ خاطر میں خالق و مخلوق کے رشتے پر مختلف خطوط کے مباحث پر نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ ہر جگہ ترجمان القرآن کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ اسی طرح خدا کے وجود، توحید اور تخلیقِ عالم کے موضوعات کا معاملہ بھی ہے۔ مندرجہ ذیل دو مثالوں سے اس موضوعاتی مناسبت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ مولانا غبارِ خاطر میں لکھتے ہیں کہ :

"یہ کیا بات ہے کہ انسان خدا کے ماورائے تعقل اور غیر شخصی تصور پر قانع نہیں رہ سکا اور کسی نہ کسی شکل میں اپنے فکر و احساسات کے مطابق ایک شخصی تصور پیدا کرتا رہا ــــــ اس کی علت بھی یہی ہے کہ انسان کی فطرت کو بلندی

کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی پیاس بغیر ایک متشخص اور علائق نواز تصور کے بجھ نہیں سکتی۔ حقیقت کچھ ہی ہو، لیکن یہ تصور جب کبھی اس کے سامنے آئے گا تو تشخص کی ایک نقاب چہرہ پر ضرور ڈال لے گا۔ یہ نقاب کبھی بھاری رہی، کبھی ہلکی ہوگئی، کبھی ڈرانے والی رہی، کبھی لبھانے والی بن گئی۔ لیکن چہرے سے کبھی اتری نہیں۔ اور یہیں سے ہماری دیدۂ صورت پرست کی ساری درماندگیاں شروع ہوگئیں۔" (غبارِ خاطر ۱۱۹)

اسی موضوع پر ترجمان القرآن میں وہ اس طرح اظہارِ خیال کر چکے ہیں :۔

"عقلِ انسانی کا ادراک محسوسات کے دائرے میں محدود ہے، اس لیے اس کا تصور اس دائرے سے باہر قدم نہیں نکال سکا۔ وہ جب کسی ان دیکھی اور غیر محسوس چیز کا تصور کرے گی تو ناگزیر ہے کہ تصور میں وہی صفات آئیں گی جنھیں وہ دیکھتی اور سنتی ہے اور جو اس کے حاسۂ ذوق و لمس سے باہر نہیں ہے۔۔۔۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کبھی ذہنِ انسانی نے خدا کی صورت بنانی چاہی تو ہمیشہ وہی بنائی جیسی صورت خود اس نے اور اس کے احوال و ظروف نے پیدا کر لی تھی۔ جوں جوں اس کا معیارِ فکر بدلتا گیا وہ اپنے معبود کی شکل و شباہت بدلتا گیا۔ اسے اپنے آئینۂ تفکر میں ایک صورت نظر آتی تھی، وہ سمجھتا تھا یہ اس کے معبود کی صورت ہے، حالانکہ وہ اس کے معبود کی صورت نہ تھی خود اسی کے ذہن و صفات کا عکس تھا فکرِ انسانی کی سب سے پہلی درماندگی یہی ہے جو اس راہ میں پیش آئی۔"

(ترجمان القرآن ۱۳۲)

ہرچند کہ ان دونوں اقتباسات میں موضوع کی یکسانیت بھی ہے اور ان کے لب و لہجے پر مولانا آزاد کے مخصوص اسلوبِ نثر کی چھاپ بھی، مگر یہ دونوں نمونے ان کے ممتاز ترین اندازِ نگارش کی نمائندگی نہیں کرتے۔ ان دونوں نمونوں میں جو مناسبت ہے وہ مواد کی ہے، لفظیات کی ہے اور طرزِ فکر کی ہے۔ اور یہ مناسبت بھی اسی مفروضے کو پایۂ اعتبار تک پہنچاتی ہے کہ غبارِ خاطر کی شکل میں سامنے آنی والی بعد کی تحریروں میں اُسی فکری، علمی اور ادبی شخصیت کا ارتفاع نظر آتا ہے، جس کی تشکیل کے عناصر ترجمان القرآن لکھنے کے عمل کے ساتھ ساتھ اعتدال و استحکام کی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ورنہ کیا سبب ہے کہ 'غبارِ خاطر' میں زیرِ بحث آنی والی 'دیدۂ صورت پرست کی درماندگی' کا مسئلہ ترجمان القرآن میں 'فکرِ انسانی کی پہلی درماندگی' کے لفظوں میں بہت سے موجود دکھائی دیتا ہے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ فطرت کے یکساں فیضانِ قدرت کا نکتہ، غبارِ خاطر میں نظامِ قدرت کے تحت جاری و ساری مساوات اور نظارۂ حسنِ فطرت کی بلا تفریق دعوت کے عنوانات سے بار بار ہمارے ذہن کو ترجمان القرآن کے مباحث و مسائل کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کیا اس نوع کی ان گنت مماثلتوں کے باوجود اس حقیقت سے انکار آسان ہے کہ ترجمان القرآن سے حاصل ہونے والی بصیرت ہی مولانا آزاد کے بعد کے اسلوبِ نگارش اور اسلوبِ فکر کے لیے سرچشمۂ فیض کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد کی ابتدائی علمی و ادبی کاوشیں بھی اپنی معاصر علمی و ادبی سرگرمیوں کے سیاق و سباق میں درجۂ اول کے درجے میں شمار کی جانے لگی تھیں، مگر خود مولانا کے اپنے ذہنی، فکری اور ادبی ارتقا میں وہ کون سا مرحلہ تھا جسے نقطۂ عروج کا نام دیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب بالعموم غبارِ خاطر کے حوالے سے دینے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، یا پھر ان کے اسلوبِ نگارش

کے مطالعہ میں ارتقائی مراحل کو ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد نے شروع سے ہی علمی اور صحافتی دنیا میں اپنی انفرادیت کے نقوش مرتسم کر دیئے تھے، مگر کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کی ابتدائی انفرادیت، ان کے خاندانی پس منظر، علم و فضل اور مجتہدانہ انحراف کی رہین منت تھی۔ اور اگر ایسا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ مولانا کے اظہار کے تمام وسائل میں ان کی ناپختہ انفرادیت اور جدت اس حد تک حیرت خیز اور مرعوب کن تھی کہ ان کی ابتدائی ناہموار نثر اور بوجھل اسلوب تحریر کو ہی ان کے بنیادی اسلوب کا نام دیا جاتا رہا۔ اس خلط مبحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا آزاد کے ابتدائی زمانے کی نثری کاوشوں پر جو فیصلے صادر کیے گئے ان ہی کا اطلاق مولانا کے متوازن، متحمل اور اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے عمدہ ترین نمونوں پر بھی کر دیا گیا۔ جب کہ اس نوع کے نثری نمونے تذکرہ کے بعد کی تحریروں میں سامنے آنا شروع ہوئے تھے۔ چونکہ اس نوع کے غیر معمولی نثری اسلوب نگارش کی نمائندگی سب سے پہلے ترجمان القرآن میں اور بعد میں خصوصیت کے ساتھ غبار خاطر میں ملتی ہے۔ اس لیے اگر مولانا آزاد کی نثر نگاری کے ارتقا کو ان کے ذہنی اور ادبی سفر کے پورے سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمان القرآن سے پہلے کی نثر ان کے اسلوب بیان کی تشکیل کے دور کی نمائندگی کرتی ہے اور ترجمان القرآن کے بعد کی نثری نگاری خواہ وہ رام گڑھ کے تحریری خطبۂ صدارت (کانگریس) کی نثر ہو یا غبار خاطر کی، ترجمان القرآن کے پختہ علمی اور تخلیقی اسلوب کی توسیع ہے۔

ترجمان القرآن کے اسلوب بیان کی چند مثالیں پہلے پیش کی جا چکی ہیں، مگر ان مثالوں میں علمی، خطیبانہ اور عربی آہنگ زیادہ نمایاں ہے جب کہ تخلیقی انداز بیان کو اوپری سطح کے بجائے زیریں لہروں کے طور پر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسی تفسیر میں اُس تخلیقی نثر کے بھی عمدہ ترین نمونے ملتے ہیں جن کی تشکیل میں شعری اور جمالیاتی محرکات زیادہ اہم کردار ادا کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نمونے علمی اور استدلالی شان سے بھی محروم نہیں ہیں اور ان میں اثر انگیزی اور سحر طرازی کی غیر معمولی قوت بھی پنہاں ہے۔

> "جس دنیا میں سورج روز چمکتا ہو، جس دنیا میں صبح ہر روز مسکراتی ہو اور شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے مزین اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہو۔ جس کی بہار سبزہ و گل سے لدی ہوئی اور جس کی فصلیں لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گرانبار ہوں، جس دنیا میں روشنی اپنی چمک، رنگ اپنی بوقلمونی، خوشبو اپنی عطر بیزی اور موسیقی اپنا نغمہ و آہنگ رکھتی ہو۔ کیا اس دنیا کا کوئی باشندہ آسائش حیات سے محروم اور نعمت معیشت سے مفلس ہو سکتا ہے۔" (ترجمان القرآن ۴)

> "اگر سمندر میں طوفان نہ اُٹھتے تو میدانوں کو زندگی و شادابی کے لیے ایک قطرۂ بارش میسر نہ آتا۔ اگر بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نہ ہوتی تو باران رحمت کا فیضان بھی نہ ہوتا۔ اگر آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا مادہ اس کرہ کی تمام سطح کو پارہ پارہ کر دیتا۔ تم بول اُٹھو گے، یہ مادہ پیدا ہی کیوں کیا گیا؟ لیکن تمہیں جاننا چاہیے کہ اگر یہ مادہ نہ ہوتا تو زمین کی قوت نشو و نما کا ایک ضروری عنصر مفقود ہو جاتا۔"

(ترجمان القرآن ۶۹)

"ہر قوت استعداد ڈھونڈھ رہی ہے اور ہر تاثیر، اثر پذیری کے انتظار میں ہے جوں ہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشو و نما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ معاً تمام کارخانۂ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی تمام کارفرمائیاں، فضا کے تمام تغیرات، زمین کی تمام قوتیں، عناصر کی تمام سرگرمیاں صرف اس انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ ہوتا ہے اور کب دہقان کی جھولی سے زمین پر ایک دانہ گرتا ہے۔" (ترجمان القرآن ۳۹)

ان اقتباسات میں شعری اور جمالیاتی محرکات کی کارفرمائی نے کیوں کر سحر کارانہ تاثر کا اعجاز پیدا کیا ہے اس کا راز دراصل قرآنی لب و لہجہ کے ساتھ قوت متخیلہ کی شمولیت میں مضمر ہے۔ یہی تخیلی قوت سمندر کے طوفان اور بارش کے قطرے کو، بادل کی گرج اور فیضان رحمت کو، پہاڑوں کی آتش فشانی اور سطح زمین کے توازن کو، اور چیونٹی کے انڈے سے نکلنے والے بچے اور دہقان کی جھولی سے گرے ہوئے دانے، جیسے غیر متعلق اور قدرے متخالف مظاہر فطرت کو ایک دھاگے میں پرو دیتی ہے۔ تخیل کی یہی کارفرمائی ہے جو تفسیر قرآن میں قرآنی آہنگ کے ساتھ انشاف اور ایک تخلیقی اپج رکھنے والے ذہن کی ہمہ جہت بصیرت، کو ایک ساتھ، اسلوب فکر اور اسلوب نثر کا حصہ بنا دیتی ہے۔ ان اقتباسات میں حسی پیکروں کی مدد سے قاری کے جملہ حواس کو متحرک کرنے کی طاقت بھی ہے اور بعض مجرد حقائق کو مجسم بنا کر پیش کرنے کی تمثیلی شان بھی۔ ترجمان القرآن کی علمی اور تخلیقی نثر کے ان نمونوں کو سامنے رکھ کر، اگر غبار خاطر کے اُن حصوں کا مطالعہ کیا جائے جن میں خطیبانہ انداز اظہار کے ساتھ ساتھ شعری اور جمالیاتی طریق کار کی کارفرمائی نمایاں ہے، تو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ مولانا نے ترجمان القرآن میں متعین ہونے والے اسلوب کو بعد میں کن جہات سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے۔

"کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطے کی روشنی میں پھرتے ہوئے ملے۔ پھولوں کی خوشبو چُن چُن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔" (غبارِ خاطر ۲۲)

"جس مرقع میں سورج کی چمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں، اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں ۔۔۔۔ فطرت کی اُس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دھکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر، ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال سکتی ہو۔" (غبارِ خاطر ۶۰)

" احاطے کے شمالی کنارے میں

" احاطے کے شمالی کنارے میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر ہے، نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔"

(غبارِ خاطر ۳۰)

"مغربی رُخ کے تمام کمرے کھلے اور چشم براہ تھے، قطار کا پہلا کمرہ میرے حصے میں آیا، میں نے اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چارپائی پر کہ بچھی ہوئی تھی، دراز ہو گیا۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری"

(غبارِ خاطر، ۳۰)

غبارِ خاطر کے شعری اور جمالیاتی طریق کار کے جو نمونے ان چند اقتباسات میں ملتے ہیں ان کا سلسلہ مزید مثالوں سے دراز تر کیا جاسکتا ہے اور بتایا جاسکتا ہے کہ جہاں مولانا نے تاج محل کے در و دیوار اور گنبد و مینار کو اپنی ستار نوازی اور نغمہ سرائی سے مسحور اور عالم وجد میں دکھانے کی کوشش کی ہے یا جہاں چڑیا چڑے کی کہانی میں (ایک نوآموز طائر بچے کو قوت پرواز سے آشنا ہوتے ہوئے دیکھا ہے وہاں اور اس طرح کے دوسرے غیر معمولی نثر پاروں میں، محولہ بالا مثالوں کی طرح، ان کے تخلیقی جوہر کے کیا کیا عناصر اپنا رول ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم مختصراً یہ ضرور عرض کیا جاسکتا ہے کہ اس نوع کے تمام نثر پاروں میں حسن تعلیل، تمثیل نگاری، پراڈوکس کا استعمال اور بصری اور سمعی پیکریت اس حد تک شامل ہو گئی ہے کہ جگہ جگہ نثر اور شاعری کی تفریق تک مٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی توجیہہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ وہ نثر نگار جو تفسیر اور اصول تفسیر کی سخت پابندیوں میں بھی اپنے مخصوص علمی اور تخلیقی اسلوب نگارش کے جوہر دکھا چکا ہے وہ اپنے مکاتیب اور انشائیوں جیسی آزاد اصناف میں اپنی افتادِ طبع اور جمالیاتی شعور کو استعمال کرکے نثر اور شعر کی روایتی حد فاصل کو کیونکر عبور نہیں کرسکتا۔ اس موقع پر اگر ڈگلس I.H.DOUGLAS کے ایک تجزیے کے دو نتائج کی مدد لیں تو بات مزید واضح ہوسکتی ہے۔ وہ مولانا کے دانش وارانہ اور مذہبی مزاج کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے مولانا کے ذہن کو اس طرح سمجھتا ہے۔

"آزاد کے اندازِ نگارش اور شعری پیکر تراشی سے پتا چلتا ہے کہ ان کے سوچنے سمجھنے کا انداز جذباتی زیادہ ہے اور عقلی کم ہے"

"مذہب کے سلسلے میں آزاد کا ادراک ایک منضبط ذہن کے ماہر دینیات کا نہیں بلکہ ایک شاعرانہ ذہن رکھنے والے شخص کا ہے"

I.H.DOUGLAS(p.204A.K.A.INTELLECTUAL AND RELIGIOUS BIOGRAPHY)

ان دونوں باتوں سے مولانا آزاد کی نثر نگاری پر کسی براہِ راست فیصلے کا تو ثبوت نہیں ملتا مگر بالواسطہ طور پر اس تخلیقی ذہن کو سمجھنے میں پوری مدد ملتی ہے جو ان کی نثر میں جذبے کی شمولیت اور شاعرانہ پیکر تراشی کے وسیلے سے تخلیقی شان پیدا کر دیتا ہے، اور یہی ذہن جب مذہبی مباحث میں اپنے ذہن کی اس مخصوص رو کو شامل کر دیتا ہے تو ترجمان القرآن، کی نثر بھی اپنے تمام علمی اور استدلالی رنگ و آہنگ کے باوجود ایک تخلیق کار کے قلم کا کرشمہ دکھائی دینے لگتی ہے۔

ان معروضات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت میں چونکہ علمی، مذہبی اور قرآنی روایت کے ساتھ ساتھ، شاعرانہ افتادِ طبع اور جمالیاتی ذوق کے محرکات بھی بخوبی ہم آمیز تھے، اس لیے ان کے اندازِ فکر میں ہی نہیں بلکہ اسلوبِ اظہار میں بھی علمی روایت اور تخلیقی مزاج کا عمل مشترک طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ روایت اور انفرادیت کی اس آمیزش کا پہلا اور بھرپور نمونہ ترجمان القرآن کے اسلوبِ تحریر اس لیے بھی نظر آتا ہے کہ ترجمان القرآن کے مباحث کا موضوع مولانا کے روایتی اندازِ فکر کی نمائندگی کرتا ہے اور ان محرکات کو بھی رو بہ عمل لانے کا موجب بنتا ہے جو مولانا آزاد کی افتادِ طبع اور جمالیاتی ذوق کا حصہ تھے۔ (بقیہ صت ۶۶ پر)

خادم حسین

عاشق حسین بٹالوی کی یادیں

ہفت روزہ "ندا" کی اشاعت ۱۲ دسمبر اور ۱۹ دسمبر ۱۹۸۹ء میں جعفر قاسمی کا ایک مضمون چھپا ہے جس میں عاشق حسین بٹالوی کے بارے میں بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ کچھ ادبی، کچھ معاشرتی - اور کچھ سیاسی ـــــ جعفر قاسمی صاحب نے بٹالوی صاحب کے ساتھ ایک عرصہ گزارا، ظاہر ہے، ایک آدمی دوسرے آدمی سے متاثر ہوتا ہے تو اُس کے بارے میں تعریفانہ انداز اختیار کرتا ہے مگر بقول شورش "بعض اوقات خوبصورت چہرے آنکھوں کو اور خوبصورت الفاظ کانوں کو دھوکا دے جاتے ہیں"۔ قاسمی صاحب کے قلم نے اگر بٹالوی صاحب کے متعلق دھوکا نہیں کھایا اور اُن کی تحریر واقعی مبنی بر حقیقت ہے، تو پھر اِس مضمون میں بیان کردہ واقعات و حالات خود شاہد ہیں کہ بٹالوی صاحب کی زندگی، قول و فعل اور کردار و گفتار کے لحاظ سے بہت سے تضادات کا مجموعہ تھی۔ بٹالوی صاحب کی موت کے بعد اِس تجزیئے کی چنداں ضرورت نہ تھی، مگر آنے والی نسل کو غلط فہمی سے بچانے اور مستقبل کے مؤرخین کو تاریخی ناانصافی سے دُور رکھنے کے لئے متذکرہ بالا مضمون کا مختصر سا جائزہ نذرِ قارئین ہے ـــــ قاسمی صاحب نے تحریر کیا ہے:

"مذہب کے بارے میں حتی الوسع وہ دِل آزاری سے کوسوں دُور رہے۔ بالعموم حافظ کا یہ شعر اُن کی رواداری اور رسم پر صادق آتا تھا ؎

"مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن ؛ کہ در شریعتِ ما جز ازیں گناہے نیست"

اور اِسی کے ساتھ ہی قاسمی صاحب نے بٹالوی صاحب کی مذہب آزادی اور دُوسروں کی دِل آزاری کے واقعات بھی خود ہی تحریر کئے ہیں:

"مولانا عبدالمجید سالک چیف ایڈیٹر "اسلامک ریویو" لندن۔ نجی گفتگو میں خیرالقرون کی بعض شخصیتوں کے بارے میں غلط کلامی کے مرتکب ہوتے تھے۔ جس کے زیرِ اثر عاشق صاحب نے ایک بار بی بی سی کُش